پاکستان میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ میں ناکامی کے اسباب

(مندرجہ ذیل تقریر ۱۲ / ستمبر ۱۹۹۵ء کو روٹری کلب
(Rotary Club Metroplitan) لاہور کی ایک دعوت
پر کی گئی تھی، موضوع کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اسے
قارئین المعارف کے لیے شائع کیا جارہا ہے، "ادارہ)

صاحب صدر اور معزز بھائیو!

میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے حسن ظن سے کام لیتے ہوئے ایک اہم اور نازک موضوع پر تقریر کرنے کے لیے مجھے بلایا۔ ہمارا موضوع ہے، "پاکستان میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ میں ناکامی کے اسباب"۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اس موضوع پر گذشتہ پچاس برس میں شعوری یا لاشعوری طور پر جس انداز سے تقریریں کی ہیں، ان میں "سیاست" زیادہ ہے اور شریعت کم۔ چنانچہ ہم منزل پر نہ پہنچ پائے۔ علامہ اقبال نے ایک انگریزی لیکچر میں ھوبز کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب بن سوچے سمجھے (میکانیکی طور پر) چند خاص افکار اور جذبات کو بار بار ایک ہی انداز میں دہرایا جائے، جیسا کہ آج اکثر مسلمان ملکوں میں ہو رہا ہے، تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کوئی فکر یا جذبہ نہیں ہے۔ (۱)

افسوس! کہ یہی کچھ یہاں ہوا کہ ہماری سوسائٹی، عدل و انصاف کی اس منزل تک نہ پہنچ پائی، جہاں شریعت اسے پہنچانا چاہتی تھی۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ سے لے کر

اب تک اہل علم کی رائے میں شریعت کا تصور یہ ہے کہ یہ خدائی قانون' عدل و انصاف کی علامت ہے' جو انسان کے سیکولر اور روحانی امور کو بہ حسن و خوبی سرانجام دے سکتا ہے۔ چنانچہ شریعت عبادات اور معاملات دونوں سے تعلق رکھتی ہے۔ لفظ شریعت یا شرع یا شرعہ پانی کے گھاٹ تک جانے والی راہ یا خود گھاٹ کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ قرآن مجید میں سورہ جاثیہ اور سورہ مائدہ میں آیا ہے۔ سورہ مائدہ میں قرآن نے فرمایا: لکل جعلنا منکم شرعا و منهاجا یعنی ہم نے تم میں سے ہر جماعت کے لیے ایک راہ (مذہبی زندگی کا دستور العمل) مقرر کر دی ہے۔

چوں کہ شریعت نام ہے' مکمل عدل و احسان کا' اس لیے ابن قیم نے کہا ہے کہ ہر وہ راہ جو منزل عدل تک جاتی ہے وہ (راہ) دین ہی کا حصہ ہے۔ (۲) اس کے برعکس اگر کوئی راہ عدل کی بجائے ظلم اور اصلاح کی بجائے فساد پر منتج ہوتی ہے' تو وہ قطعاً" شریعت کا حصہ نہیں ہے' خواہ اسے کسی تاویل کے ذریعہ اس کا حصہ ہی کیوں نہ بنا دیا گیا ہو' (۳) چوں کہ قرآن مجید میں صاف طور پر حضرت داؤد اور آں حضرتؐ سے کہا گیا ہے کہ ان کے فیصلے عدل و انصاف اور حق کے مطابق ہونے چاہییں (ملاحظہ ہو سورہ المائدہ' سورہ ص) اسی لیے علماء نے دنیا میں پیغمبروں کی آمد کا مقصد قیام عدل قرار دیا ہے۔ چنانچہ عدل و انصاف' اسلام کی ایک بلند قدر (Higher Value) ہے جس کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے' انسانی ارادہ نہیں۔ عدل کی نفی دراصل حکومت کی نفی ہے۔ اسی لیے بعض علماء نے کہا ہے کہ ایک منصف اور عادل غیر مسلم حاکم ایک ظالم مسلم حکمران سے بہتر ہے۔ اسلام میں عدل کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے' کہ قرآن مجید نے فرمایا ہے کہ کسی گروہ یا قوم سے تمہاری دشمنی کا یہ معنی نہیں کہ تم عدل کی راہ کو چھوڑ دو' (۴) یعنی ذاتی تعلقات کی نوعیت جو بھی ہو' بنیادی طور پر تمہاری Commitment عدل و انصاف سے رہنی چاہیے۔ عدل و انصاف کے اس بلند اور پاکیزہ تصور کو بروئے کار لانے کے لیے خلافت

راشدہ' خاص طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کامیاب تجربے کئے۔ کہا جاتا ہے کہ "یک من علم را دہ من عقل باید۔" یعنی ایک من علم کے لیے دس من عقل کی ضرورت ہے۔ چنانچہ شریعت یا خدائی قانون کو نافذ کرنے والی قوت نافذہ کے لیے جہاں فلسفہ شریعت اور اس کے مقاصد سے آگاہی ضروری ہے' وہاں اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے "دس من" بصیرت' تجربہ اور سیاست کی بھی ضرورت ہے' نیز اس کے لیے ضروری ہے کہ:

۱۔ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس قانون کی پابندی کرے' جس کے نفاذ کی وہ علم بردار ہے۔

۲۔ وہ خدا اور قوم کے سامنے اخلاقی ذمہ داری کا گہرا شعور رکھتی ہو۔ صحیح بات یہ ہے کہ قانون کی کامیابی کا راز اسی بات میں مضمر ہے کہ انسان کی اخلاقی حس زندہ ہو۔ یہ بات محتاج بیاں نہیں کہ انسان میں اخلاقی ذمہ داری کا شعور اس وقت اجاگر ہوتا ہے جب وہ زندگی کے بلند مقصد سے سرشار ہو۔ ایسے بلند مقصد کا پتہ مذہب دیتا ہے۔ صرف قانون بہ قول افلاطون انسان کو اخلاقی انسان نہیں بنا سکتا۔

۳۔ قوت نافذہ یا حکمران اپنی روایات' نظریہ حیات اور اپنے معاشرے کے رسم و رواج' اجتماعی اور معاشی حالات کا شعور رکھتے ہوں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد اپنی پہلی تقریر میں کہا: "لوگو! ہرچند مجھے والی چن لیا گیا ہے۔ لیکن میں تم میں سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر اچھے کام کروں' تو میری امداد کرو' اگر ایسا نہ کروں تو میری اصلاح کرو۔"

آپ نے اپنی وفات کے وقت اپنی صاحبزادی سے کہا کہ مجھے انہی کپڑوں میں دفن کر دینا' جن میں میری وفات ہوئی ہے' کیوں کہ زندہ آدمی "

نئے کپڑوں کا زیادہ حقدار ہے۔" حضرت ابوبکر کی تقریر' وصیت اور عمل نے ہمیں بتایا کہ خلافت یا حکومت نام ہے خالق کی اطاعت اور مخلوق کی خدمت کا۔

آپ نے جس خدا ترسی' بصیرت' متانت' استقامت اور گہری اخلاقی ذمہ داری سے اپنے فرائض سرانجام دیئے' وہ ہماری تاریخ کا ایک تاب ناک حصہ ہے۔ آپ کے بعد آپ کے جانشین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فطرت نے جن فکری اور عملی صلاحیتوں سے نوازا تھا' ان کا بھرپور اظہار ان کے مجتہدانہ کارناموں کی صورت میں ہوا۔ چوں کہ ان کے سامنے ایک عادلانہ نظام کا قیام تھا' جس میں سوسائٹی کے ہر شہری کو اپنی جان' مال' ناموس اور معاش کا مکمل تحفظ ہو' اس لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک وقت کے بعد محسوس کیا کہ ان کا تاریخی تجربہ ان مطلوبہ نتائج پر منتج نہیں ہوا' جنہیں وہ ایک صحت مند اخلاقی اور مادی طور پر خوش حال سوسائٹی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا! "آج مجھے جن باتوں کا پتہ چلا ہے' اگر ان کا پہلے پتہ چل گیا ہوتا' تو میں دولت مندوں سے ان کی زائد دولت چھین کر حاجت مندوں کو تقسیم کر دیتا۔" حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں جو اجتہادی فیصلے کئے' ان میں سے بعض بہ ظاہر قرآن و سنت سے متعارض نظر آتے تھے' لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ ان فیصلوں نے یہ بتا دیا کہ مسلمانوں کی ہر نسل کو اپنے مسائل حل کرنے کا بہ قول اقبال' حق حاصل ہے۔

بہر نوع شریعت اسلامیہ کی بنیاد پر نئی سوسائٹی کی تخلیق یا "خدائی مملکت" Kingdom Of God کے قیام کے لیے شریعت کی رہنمائی میں ہماری تاریخ میں جو کامیاب تجربے کئے گئے' ان سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ شریعت اجتہاد کا ایک مسلسل عمل ہے جو وحی کی روشنی میں سوسائٹی کی فلاح و بہبود اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے برابر جاری رہتا ہے۔ اس لیے مرحوم سید قطب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ اسلامی قانون نہیں' جس نے اسلامی

سوسائٹی کو جنم دیا ہے' بلکہ یہ اسلامی سوسائٹی ہے' جس سے اسلامی قانون نے ارتقاء حاصل کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک واقعہ میں ایک فیصلہ سنایا' کچھ مدت کے بعد اسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ پیش آیا تو آپ نے دوسرا فیصلہ سنایا' جس پر ایک صاحب نے کہا حضرت! آپ نے اسی قسم کے واقعہ میں پہلے دوسرا فیصلہ دیا تھا۔ آپ نے فرمایا:۔ وہ بھی درست تھا' یہ بھی درست ہے۔ حضرت مسیحؑ نے سچ فرمایا کہ سبت (ہفتے کا دن) انسان کے لیے ہے' انسان سبت کے لیے نہیں۔

امریکہ کے ایک مذہبی سکالر (Paul Tillich) خدائی مملکت کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ خدائی مملکت تاریخ میں جس راہ پر چل کر کام کرتی ہے' یہ راہ وہ راہ نہیں ہے۔ جس پر کلیسا چل کر تاریخ کے رخ کو متعین کرتا ہے' بلکہ یہ ایک تاریخی عمل ہے' (جس میں نیکی برائی پر قابو پاتی ہے۔) مثلاً سیاسی اقتدار کا پرامن طریق سے انتقال' یا سیاسی مسائل کو طاقت کی بجائے جمہوری طریق سے حل کرنا۔ یہ سب باتیں دراصل خدائی مملکت کی کامیابیوں میں شمار ہوتی ہیں۔ (۵)

یہ ہے اختصار کے ساتھ اسلامی شریعت اسلامیہ کا تصور جو سراپا عدل ہے اور رحمت' لیکن افسوس کہ ہم نے اپنی غفلت سے شریعت اسلامیہ کو اس کے اہم مثبت اور ایجابی پہلو کو اس کے مفہوم و معنی سے خارج کر کے شریعت کو تعزیرات' حدود اور عورت کی آدھی شہادت تک محدود کر دیا ہے۔ آج مغرب میں اکثر لوگ شریعت کے خلاف جو پروپیگنڈا کر رہے ہیں' اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان کے سامنے کوئی اچھا نمونہ پیش نہیں کیا۔ بے شبہ تعزیرات اسلامی شریعت کا ایک حصہ ہیں' لیکن شریعت اسلامیہ کا بنیادی مقصد انسانی وقار کے تحفظ کے لیے سوسائٹی میں عدل و انصاف کا قیام اور انسان کے روحانی اور مادی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ایک نئے صحت مند معاشرے کی

تخلیق ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ دین اور شریعت دو مترادف لفظ نہیں ہیں' دین زندگی کے بنیادی مسائل سے بحث کرتا ہے' مثلاً خدا کا وجود' رسالت' حیات بعد الموت' تمام پیغمبروں نے ایک ہی دین کی دعوت دی ہے' البتہ شریعتیں مختلف ہیں' کیوں کہ وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ قانون اور احکام بدل جاتے ہیں' نیز یہ کہ شریعت اسلامیہ کا نفاذ صرف مسلمانوں پر ہوتا ہے' غیر مسلموں پر نہیں' یہی نکتہ تھا جو سوڈانی حکمرانوں کی نگاہ سے اوجھل رہا' چنانچہ جب اسے جنوبی سوڈان میں جہاں بڑی تعداد میں عیسائی بستے ہیں' لاگو کیا گیا' تو ہنگامہ ہو گیا اور آج تک جاری ہے۔ اب خرابی بسیار کے بعد سوڈان کے ایک رہنما حسن ترابی نے کہا ہے کہ (۱) جنوبی سوڈان میں ثقافتی آزادی حاصل ہوگی۔ (۲) وہاں حدود کا نفاذ نہیں ہوگا۔ سوڈان کے ایک سابق فوجی حکمران نمیری نے اپنا اقتدار بچانے کے لیے شریعت کا نعرہ بلند کیا' اور ۱۹۸۴ء میں سوڈان کے ستر سالہ بوڑھے معروف روحانی اور جمہوری رہنما شیخ محمود طہ کو دار و رسن کے سپرد کر دیا۔ شیخ موصوف جہاں بنیاد پرستی کے خلاف تھے' وہاں وہ فوجی قیادت کو بھی اسلام کے خلاف تصور کرتے تھے۔ اسی لیے ہم نے پہلے کہا ہے کہ شرعی احکام کے نفاذ کے لیے علم کے ساتھ ساتھ عقل و دانش کی بھی ضرورت ہے۔

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ پاکستان میں شریعت اسلامیہ کا نفاذ کیوں نہ ہو سکا!

کہا جاتا ہے کہ مسلم دانش وروں نے خاص طور پر ابن خلدون نے فلسفہ سیاست کو محض ایک نظریات کا مجموعہ قرار نہیں دیا' وہ سیاست کو تدبیر مدینہ یا سیاستہ مدنیہ (ریاست کے نظم و نسق کو کامیاب طور پر سرانجام دینا) قرار دیتے تھے۔ چنانچہ سیاست ان کے نزدیک ایسا فن (Art) ہے' جس کا تعلق حقائق' واقعات اور عملی زندگی سے ہے' اس میدان میں وہ آدمی کامیاب ہے

جو اس فن میں مہارت اور عملی بصیرت (Practical Wisdom) رکھتا ہے، چنانچہ سیاسی میدان میں قوم کی رہنمائی کے لیے مندرجہ ذیل تین امور کا ہونا ضروری ہے:

۱۔ اپنی منزل سے آگاہی ازبس ضروری ہے۔ چنانچہ قوم کی رہنمائی کے مدعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے سیاسی نظام سے پوری طرح آگاہ ہو، سیاسی رہنمائی کا دعویٰ اور سیاسی نظام سے لاعلمی، ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک ڈاکٹر مریض کا معائنہ کرتا ہے، لیکن صحت کیا ہے؟ اس سے آگاہ نہیں۔

۲۔ سیاسی رہنما کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی سوسائٹی کی سیاسی، اجتماعی اور معاشی حالت سے پوری طرح آگاہ ہو، اسے اپنے معاشرے کے مسائل، اس کے مزاج، اور اس میں کام کرنے والے محرکات کا علم ہو، اسے ایک ڈاکٹر کی طرح معاشرے کی خامیوں اور بیماریوں کا بھی پتہ ہونا چاہیے۔

۳۔ اہل سیاست کو فن امامت (حکمرانی) میں بھی دسترس ہونی چاہیے، اس دسترس کے لیے اسے حکمرانی کا عملی تجربہ ہونا چاہیے۔ ہم ایک ڈاکٹر کو صرف اس لیے کامیاب ڈاکٹر قرار نہیں دے سکتے کہ وہ نظریہ صحت سے واقف ہے یا چند بیماریوں کا نام جانتا ہے۔ چنانچہ سیاست دان کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ خاص حالات میں کونسا فیصلہ سوسائٹی کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ (۲)

کہا جاتا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ نے حضرت علیؓ سے ان کے خلیفہ منتخب ہونے پر کہا کہ آپ سردست امیر معاویہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ سے تعرض نہ کریں، لیکن حضرت علیؓ نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا، دوسرے دن مغیرہ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ کل میں نے جو رائے دی تھی، وہ صحیح نہیں تھی، حضرت

علیؓ نے جواب میں کہا کہ آپ نے کل جو رائے دی تھی، وہ صحیح تھی اور آج جس رائے کا اظہار کر رہے ہو وہ غلط ہے۔ گویا حضرت علیؓ نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ مغیرہ کا مشورہ سیاسی نقطہ نظر سے درست تھا۔ ابن خلدون کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ البتہ سچائی اور حق سے غیر متزلزل لگاؤ (Commitment) کی وجہ سے حضرت علیؓ نے اسے نہیں مانا۔ (۷)

ابن خلدون نے ایک کامیاب سیاست دان کے لیے جو کچھ لکھا، وہ ان کی اپنی ناکام سیاست (وہ سکالر اور مفکر کے ساتھ ساتھ وزیر اعظم بھی رہ چکے تھے) کا کامیاب تجزیہ ہے۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں شریعت اسلامیہ کے نفاذ کی ناکامی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اہل سیاست یا حکمران اپنی منزل سے آگاہ نہیں تھے اور نہ ہی انہیں اپنے عوام کے معاشی، اجتماعی اور مذہبی مسائل سے آگاہی حاصل تھی، یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ بانی پاکستان قائداعظمؒ کے علاوہ شاید ہی کسی حکمران کے ذہن میں ایک اخلاقی، فلاحی، جمہوری ریاست کا کوئی واضح تصور موجود ہو۔ ۱۱ / اگست ۱۹۴۷ء اور یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسمبلی اور سٹیٹ بینک آف پاکستان میں انہوں نے جو تاریخی تقریریں کی ہیں، ان سے یہ بات صاف طور پر واضح ہے کہ وہ مغرب کی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے حق میں قطعاً نہیں تھے۔ انہوں نے مغربی جمہوریت کو دو عالمی جنگوں کا سبب قرار دیا، وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے مشن کو پورا کرتے ہوئے، پاکستان کو امن و آشتی، خوش حالی اور مسرتوں کا گہوارہ بنا کر پوری انسانیت کے سامنے ایک نمونہ پیش کریں۔ چنانچہ انہوں نے سٹیٹ بنک میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اس کا "تحقیقاتی ادارہ" انسانی مساوات (Equality of Manhood) اور سماجی انصاف (Social Justice) کی بنیادوں پر بنکاری کا ایسا نظام وضع کرے، جو اسلام کے اصولوں کے مطابق ہو، انہوں نے پاکستان کا ایسا جمہوری دستور بنانے کے لیے برطانوی ماہرین دستور کی خدمات بھی حاصل کرنا چاہیں تھیں، اب اسے قوم

کی بدقسمتی ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ستمبر ۱۹۴۸ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ مزید یہ کہ انہوں نے کوئی اپنا جانشین نہیں چھوڑا' جو اپنی قوت فیصلہ' تجربہ' بصیرت' اخلاص اور استقامت میں سوسائٹی میں کوئی مقام رکھتا ہو۔ چنانچہ حصول اقتدار کی جنگ شدید ہوئی' جس میں بالاخر بیروکریسی نے میدان جیت لیا۔ اس سے یہ توقع رکھنا عبث تھا کہ وہ اسلام کے بلند اصولوں اور روح عصر کے مطابق کوئی دستور بنانے میں کامیاب ہو جائے گی یا شریعت اسلامیہ کے نفاذ کے لیے کوئی مثبت' مربوط اور ٹھوس پروگرام وضع کرسکے گی۔ چنانچہ دستور کا مسئلہ کئی سال تک کھٹائی میں پڑا رہا' صوبوں کے باہمی اختلافات آہستہ آہستہ سامنے آتے گئے۔ مزید یہ کہ مرکز اور صوبوں کی وزارتوں کو غیردستوری طور پر رخصت کیا جاتا رہا' مشرقی پاکستان کی اکثریت کو ختم کرنے کے لیے حکومت نے مغربی پاکستان کو ایک انتظامی وحدت قرار دیا' جس سے مختلف صوبوں میں غلط فہمیوں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا' ستم پہ ستم یہ ہوا کہ اپنی اور مغربی سامراج کی تاریخ سے یک قلم تغافل برتتے ہوئے حکومت معاہدہ بغداد جیسے "خالص" سامراجی معاہدوں میں شامل ہو گئی' جس کے نتیجے میں ۱۹۵۶ء میں نہر سویز کے بحران میں حکومت نے اپنے عوام کے جذبات کو ٹھکراتے ہوئے اہل مصر کی بجائے مغرب کا ساتھ دیا' جس سے ساری عرب دنیا میں پاکستان کی سبکی ہوئی۔ القصہ سیاست کے کھیتوں میں ہاتھیوں کی لڑائی برابر جاری رہی' اس میں کون جیتا اور کون ہارا' اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں' البتہ سیاست کے کھیت ویران ہوگئے اور پوری قوم اس المیہ سے دوچار ہوئی کہ اقبال و جناح پاکستان کو ایک مثالی جمہوری ریاست بنانے کے لیے جو پروگرام رکھتے تھے' حکمراں اس پروگرام کو عملی طور پر اپنا نہ سکے۔صحیح بات یہ ہے کہ ان کے پاس کسی فکری نظام پر غور کرنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا' واقعہ یہ ہے کہ قیام شریعت کے لیے ہمیں ایک طویل صبر آزما کٹھن سفر طے کرنا ہوگا' اپنے تعلیمی' اقتصادی اور

زرعی نظام کو بدلے اور ایک صاف ستھری' لائق' منظم اور ذمہ دار انتظامیہ کے تعاون کے بغیر "خدائی مملکت" کا قیام ممکن نہیں۔ فشر (Fisher) نے "تاریخ یورپ" میں لکھا ہے کہ برصغیر میں برطانوی راج کے قیام کا سہرا آئی۔ سی۔ ایس (I.C.S) کے ان پانچ ہزار انسانوں کے سر ہے' جو انتہائی' منظم محنتی اور مخلص تھے۔

اہل سیاست کی ناکامی پر منطقی دلائل دینے کی چنداں ضرورت نہیں' آئین سازی میں تاخیر' پھر فوج کی آمد اور آئین کی منسوخی' دوسرے آئین کی تیاری' پھر اسی کی منسوخی' ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کا المیہ' اس المیہ کے باوجود ۱۹۷۷ء میں پھر دستور کا تعطل اور سیاسی اور مذہبی "رہنماؤں" کا نہ صرف مارشل لاء کی تائید کرنا' بلکہ اس کی حکومت میں شریک ہو کر "شریعت اسلامیہ" کے لیے کام کرنا' غرضیکہ ان واقعات سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ اہل سیاست کی ایک بڑی اکثریت جمہوری سیاست کے فن سے آگاہ نہیں تھی' اور نہ ہی انسانی نفس کی قہرمانیوں پر قابو پانے کے لیے کسی اخلاقی ضابطہ کی قائل۔ البتہ شریعت اسلامیہ سے "مضبوط پیمان وفا" کی آواز فضا میں برابر گونجتی رہی۔

پاکستان میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ کی ناکامی کا دوسرا بڑا سبب علمائے کرام ہیں' جہاں تک علمائے حق کا تعلق ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلام کی محبت سے سرشار ہو کر علمائے حق اور ممتاز صوفیائے کرام نے برصغیر میں سعی و عمل' جدوجہد' اخلاص اور قربانی کی قابل تقلید مثالیں قائم کیں ہیں' جن پر برصغیر کے مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد علمائے حق کی ایک بڑی جماعت بھارت میں رہ گئی' کیوں کہ ہمارے اسلامی اور ثقافتی ادارے' جنھوں نے برطانوی ہند میں مسلم تشخص کو بچانے کے لیے کامیاب کردار ادا کیا تھا' کم و بیش بھارت میں رہ گئے تھے۔

بعض ممتاز علماء پاکستان میں بھی آئے' اور انہوں نے پورے اخلاص

سے مسند تدریس پر بیٹھ کر لوگوں کی علمی اور اخلاقی تربیت کی۔ لیکن یہ پاک روحیں بہت کم تھیں۔ اکثریت ان "صحافی علماء" کی تھی' جو سیاست میں اپنا نام پیدا کرنا چاہتے تھے' بے شبہ بعض لوگوں نے نام بھی پیدا کیا۔ لیکن شریعت اسلامیہ' عدل و انصاف اور جمہوریت کے قیام کے لیے کوئی ایک مثبت کارنامہ سرانجام نہ دے سکے۔ یہ لوگ چند "لفظی اصطلاحات" میں ایسے پھنسے' کہ پھر ان سے باہر نہ نکل سکے اور پوری سوسائٹی جو جاگیرداری کے پنجہ استبداد میں کراہ رہی تھی' ان کی نظروں سے اوجھل رہی اور جب کبھی زرعی اصلاحات کے نام سے کسی من چلے نے اپنی ناموری کے لیے آواز اٹھائی' تو کہا گیا کہ تحدید ملکیت ناجائز ہے' یہ شرع میں مداخلت ہے۔ لیکن وقت کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ انہی زرعی اصلاحات کو ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں قبول کر لیا گیا۔ اگر الفاظ کی یہ جنگ ہماری مذہبی جماعتوں کی ساری توانائیوں کو جذب نہ کر لیتی' تو توقع تھی کہ یہ مذہبی جماعتیں سماجی ناانصافی کے خلاف پرامن جدوجہد کا جھنڈا بلند کرتیں' اخلاقی اصلاح کا پروگرام بناتیں' اور پوری قوم جاگیرداری کی سیاست اور اس کی نجی جیلوں کی تاریکی میں زندگی بسر کرنے والے بدقسمت مرد اور عورتیں نجات پا جاتے۔ ۱۹۹۴ء میں انسانی حقوق سے متعلق کمیشن نے جو رپورٹ شائع کی ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہم عدل و انصاف کی منزل سے کتنے دور ہیں اور "آدم کی ارزانی" ہمارے بلند بانگ مذہبی دعووں کا کیوں کر مذاق اڑاتی ہے۔

یہاں یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ پاکستان کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے' اس لیے اکثریت کے جذبات و عواطف سے تغافل برتنا کسی بھی سیاسی جماعت یا مدبر کے لیے ممکن نہیں' لیکن اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ مطلوبہ نتائج پر منتج نہ ہوا' بلکہ بعض اوقات ژولیدہ فکری کا موجب بنا' مثلاً کہا گیا کہ "پاکستان میں کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا

جائے گا' جو ان اسلامی تعلیمات اور احکام کے خلاف ہو جو قرآن کریم اور سنت میں مذکور ہیں اور تمام موجودہ قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بنایا جائے گا۔" اصولی طور پر یہ بڑا ہی مستحسن فیصلہ تھا' لیکن اس فیصلہ کی تشریح میں یہ بھی کہا گیا۔ "کسی اسلامی فرقہ کے شخصی قانون کے نفاذ کے بارے میں قرآن و سنت سے مراد قرآن و سنت کی صرف وہ تعبیر ہے' جو اس فرقے کے نزدیک مسلم ہے۔" یہ تشریح بڑے دور رس نتائج کی حامل ہے۔ اس سے جج کو پابند بنایا گیا کہ وہ ایک مسلک کے مسلمہ فتاویٰ کو قبول کرے' خواہ وہ فتویٰ یا فیصلہ جج کی اپنی رائے یا عدل و انصاف کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔

مثلاً ایک بیوہ نے عدالت میں اپنے خاوند کی جائیداد سے ایک سال کے لیے خرچہ کا مطالبہ کیا اور اس مطالبے کی بنیاد قرآن مجید کی سوۃ البقرہ کی آیت نمبر۲۴۱ پر رکھی' اس آیت کی رو سے بیوہ اپنے مرحوم شوہر کے ترکہ سے ایک سال کے خرچہ کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ لیکن اس درخواست کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا کہ قرآن مجید کی یہ آیت قرآن مجید کی دوسری آیت وراثت سے منسوخ ہوچکی ہے۔ برصغیر میں بیوہ عورتوں کو جن مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے پیش نظر اگر قرآن کریم کی دونوں آیتوں پر عمل ہو جاتا' جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے۔ یعنی ایک سال کا خرچہ بھی مل جاتا اور وراثت سے حصہ بھی مل جاتا تو یہ امر قرآن مجید کی روح اور اس کی پاکیزہ تعلیمات کے عین مطابق ہوتا' لیکن عدالت نے یہ کہہ کر اس مطالبے کو مسترد کر دیا کہ "عدالت کے لیے یہ جائز نہ ہوگا کہ اس نوع کے معاملات میں قرآن کی آیات کی کوئی جدید تعبیر کی جائے جو قدیم اور عالی مرتبت مفسرین کی رائے کے خلاف ہو۔"

ایک دوسری مثال سنئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اگر خاوند ایک ہی مجلس میں اپنی بیوی کو غصے میں تین طلاق دے دے' تو وہ حنفی علما کے ہاں موثر قرار پاتی ہیں۔ اس امر سے برصغیر کی خواتین کو بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

جب ۱۹۶۲ء میں عائلی قوانین میں ایسی غیر شرعی طلاق کو ایک طلاق قرار دیا گیا' ہماری ایک مذہبی جماعت نے یہ ترمیم پیش کی "مسلمانوں کے جو فرقے اپنی فقہ کی رو سے اس طرح کی تین طلاق کو طلاق مغلظ قرار دیتے ہیں' ان کے حق میں یہ طلاق مغلظ (غیر رجعی) ہی شمار ہوگی' لطف کی بات یہ ہے کہ اس طلاق کے خلاف اسی مذہبی جماعت کے مرحوم رہنما بجا طور پر بڑے زور دار طریقہ سے لکھ چکے تھے کہ اس سے بڑے مفاسد پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پوری عرب دنیا میں طلاق کی یہ قسم (ایک مجلس میں تین طلاق دینا) ایک ہی طلاق شمار ہوتی ہے' ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے اہل علم حضرات صدیوں پہلے اس طلاق کے غیر شرعی ہونے اور ان کے مفاسد پر تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ ہم یہاں مزید مثالیں نہیں دیں گے' مزید مثالیں ملک محمد جعفر کی کتاب "پاکستان میں اسلامی قانون کا مستقبل" یا خاکسار کی ایک کتاب "قرآن مجید: اسلامی فکر کا بنیادی سرچشمہ" میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم دنیا میں اہل علم نے اسلامی قانون کی تنفیذ میں کسی ایک خاص فقہ ہی سے استفادہ نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے اسلامی قانون کی متعدد فقہی تعبیروں کو سامنے رکھ کر اس تعبیر کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے جو روح قرآن اور روح شریعت سے زیادہ قریب ہے۔ افسوس! کہ ہمارے علماء نے مسلم اور عرب دنیا میں اسلامی قانون کے طریق کار' اصلاحات اور جدید ابحاث سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔

پاکستان میں جب کبھی کسی حکومت نے برے بھلے انداز سے شرعی احکام کو نافذ کرنا چاہا' تو اس کی راہ میں ہمارے علما کا جمود اور قدامت پسندی آڑے آئی۔ ایک فقہی جزئی پر اصرار کی بجائے بہتر یہ تھا کہ کسی آدمی کو قانونی مشکل سے رہائی دلائی جائے۔ مثلاً ایک بار مغربی بنگال کے ایک مسلمان' ڈھاکہ مشرقی بنگال میں آگئے۔ لیکن اپنی بیوی کو بھارت ہی میں چھوڑ آئے اور کئی سال تک نہ تو اسے کوئی خرچ بھیجا اور نہ ہی اسے ڈھاکہ بلایا۔ مظلوم بیوی کے والد

نے عدالت سے رجوع کیا۔ عدالت نے نکاح کے فسخ کا فیصلہ سنا دیا۔ اب " علمائے کرام" نے کہا کہ عدالت کا فیصلہ شرعی طور پر صحیح نہیں کیونکہ جج غیر مسلم ہے۔ بیوی کے والد نے ۱۹۵۷ء میں مولانا ابوالکلام کو لکھا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ عدالت کا فیصلہ شرعی طور پر درست ہے اور ان کی بیٹی دوسری شادی کر سکتی ہے۔ مولانا کے اس فتوی پر غریب والد کی جان میں جان آئی۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک غیر مسلم جج کے بارے میں علماء نے جو موقف اختیار کیا' ابوالکلام ۱۹۱۶ء میں اسی موقف کے قائل تھے' لیکن مسلم خواتین کی بے پناہ مشکلات کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنی رائے سے رجوع کیا اور فسخ نکاح میں غیر مسلم جج کے فیصلہ کو شرعی طور پر درست قرار دیا۔

جب مارشل لاء کے عہد میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ کا غلغلہ ہوا' تو ڈاکٹر معروف الدوالیبی (شام کے معروف سکالر اور سابق وزیراعظم) جنرل ضیاء الحق کی دعوت پر بار بار سعودی عرب سے پاکستان تشریف لائے اور اسلامی نظریاتی کونسل سے ان کی گفت گو رہتی۔ ایک مجلس میں جو ادارہ تحقیقات اسلامی میں منعقد ہوئی' خاکسار بھی شریک تھا اور رجم کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ ڈاکٹر موصوف نے بخاری شریف کی ایک روایت سنانے کے بعد کہا کہ زنا کے قضیہ میں سزا کا فیصلہ صرف جج سنا سکتا ہے' جو ملزم کے احوال و ظروف کو دیکھ کر رجم کے علاوہ قید یا معافی کا بھی فیصلہ دے سکتا ہے لیکن ہمارے علماء نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ جب مجلس ختم ہوگئی ڈاکٹر موصوف نے خاکسار سے کہا کہ پاکستان میں آنے سے قبل میں یہ سمجھتا تھا کہ حکام شریعت کی راہ میں رکاوٹ ہیں' لیکن اب پتہ چلا ہے کہ اس راہ میں ایک بڑی رکاوٹ علماء کا جمود بھی ہے' جو شریعت اور قانون کے مزاج کو نہیں جانتے۔ ڈاکٹر دوالبی نے اپنے تبصرہ میں کوئی نئی بات نہیں کہی' یہی بات کئی سو سال پہلے ابن قیم نے بھی کہی تھی۔ ابن قیم اپنی معروف کتاب "الطرق الحکمیہ فی السیاستہ الشرعتہ" میں لکھتے ہیں: "علماء

نے شریعت کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں وہ بندوں کے مفاد کا تحفظ نہیں کر پاتی——— نیز یہ کہ انہوں نے ادراک حقیقت کی صحیح راہوں کو خود ہی اپنے اوپر بند کر لیا ہے اور یہ سمجھ رکھا ہے کہ یہ راہیں قواعد شرع کے خلاف ہیں...." (قاہرہ ۱۹۵۲ء' ص ۱۳' ۱۴)

واقعہ یہ ہے کہ جس طرح مسٹر جناح کی وفات کے بعد پاکستان کو ان کا صحیح جانشین نہیں مل سکا' جس کی وجہ سے جمہوری روایات کو بڑا نقصان پہنچا' اور ہمیں سیاست میں دھونس' دھاندلی اور دولت کی "چمک" سے واسطہ پڑا' اسی طرح اقبال نے بھی کوئی جانشین نہیں چھوڑا' جو اقبال کی بصیرت اور ناقدانہ نگاہ سے ہمارے اجتماعی حالات' قانونی وراثت اور روح عصر کا مطالعہ کرتا اور شریعت اسلامیہ کی تعبیرو تشریح اور نفاذ کے لیے ایک قابل عمل لائحہ عمل تیار کرتا' جس سے ہمیں اپنی گم گشتہ فردوس کا سراغ لگانے میں مدد ملتی۔ اگر ہم اقبال و جناح کے افکار کو سامنے رکھتے تو ہم تعزیرات اور حدود کی بجائے اپنے مقدس سفر کا آغاز اقتصاد اور معیشت کے عادلانہ نظام سے شروع کرتے اور کھیتوں میں کام کرنے والے لاکھوں محنتی اور جفاکش دہقانوں کو ایک باوقار زندگی بسر کرنے کا حق دیتے۔ اقبال نے ۱۹۳۲ء میں لاہور میں ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میری رائے میں (برصغیر) میں اسلام کا مستقبل بڑی حد تک پنجاب کے مسلمان کاشتکاروں کی آزادی پر موقوف ہے۔" ایک نئی صحت مند سوسائٹی کی تخلیق کے لیے ضروری تھا کہ اقبال مسلم سوسائٹی کو اس کی بیماریوں سے آگاہ کرتے اور اسے خود فریبی کی قید سے نکال کر حقائق کی دنیا میں لاتے' تاکہ وہ اپنا تاریخی کردار کرنے کے لیے زوال پذیر معاشرے کی بیماریوں سے نجات پا جاتی۔ چنانچہ ان کی رائے میں مسلم سوسائٹی کے غریب کاشتکاروں کو غلامی سے رہائی دلائے بغیر اسلام اپنا رول ادا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح انہوں نے ۱۹۰۹ء میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ "اس بات

کا اعتراف ضروری ہے کہ فرد کی آزادی کا نمونہ رکھتے ہوئے بھی مسلمان ایشیا کی سیاسی نشوونما کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔" گویا اقبال یہ کہہ رہے ہیں کہ فرد کی معاشی اور سیاسی آزادی کے لیے شریعت نے انہیں جو بلند نظریہ دیا تھا' وہ ایشیا میں بہ وجوہ اسے عملی شکل نہیں دے سکے۔ اگر آپ اقبال اور جناح کے بیانات کو غور سے پڑھیں' تو پتہ چلتا ہے کہ وہ شریعت کو تعزیرات یا حدود سے جنہیں صدر ریاست بہ قول حسن الھضیبی معطل بھی کر سکتا ہے' تعبیر نہیں کرتے تھے' ان کے ذہن میں شریعت ایک کلچر' تمدن اور تہذیب کی علامت ہے' اور اگر کسی سوسائٹی میں معاشی اور سیاسی میدان میں عدل و انصاف نہیں ہے' تو تہذیب اور کلچر کا سارا حسن اور اس کی ساری رعنائیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم اقبال کے اشعار کو مطربہ کی آواز میں تو سننے کے لیے بے قرار رہتے ہیں' لیکن تاریخ میں اپنا رول ادا کرنے کے لیے ہم نے سنجیدگی سے کبھی بھی اپنے اجتماعی اور سیاسی پروگرام کو اقبال و جناح کے فکر و فلسفہ کی بنیادوں پر مرتب کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ شریعت کے بارے میں پاکستان کی مذہبی جماعتوں کا تصور اقبال و جناح کے تصور سے مختلف ہے۔ بے شبہ ہر جماعت یا فرد کو اصولی طور پر ایک رائے رکھنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن مذہبی جماعتوں نے شریعت کے بارے میں جو محدود تصور قائم کیا ہے' اس کا تعلق نہ تو ہمارے عہد سے ہے اور نہ ہی شریعت کے آفاقی نقطہ نظر سے۔ اس کی بنیادوں پر کسی نئی صحت مند سوسائٹی کی تخلیق بس اک معجزہ ہو گی۔ القصہ وادی اقتدار میں گھومنے پھرنے والے حکمراں ہوں یا صحرائے سیاست میں قسمت آزمائی کرنے والے اصحاب عمائم' دونوں کے ذہن میں شریعت اسلامیہ اور اسکے نفاذ کے بارے میں کوئی واضح' صاف اور مربوط تصور نہیں تھا۔ اور نہ ہی ان دونوں میں سے کسی جماعت نے اپنی جماعت ہی میں کوئی ریسرچ سیل (Research Cell) قائم کیا' جو پروپیگنڈے سے الگ رہ کر

خالص علمی بنیادوں پر قیام شریعت کے لیے منصوبہ بندی کرتا' اور اس سلسلے میں کلاسیکی علماء' مسلم دنیا کے اہل علم اور اقبال و جناح کے افکار سے مدد لیتا۔

شریعت اسلامیہ کے نفاذ میں ہم سے جو کوتاہی ہوئی ہے اور پاکستان کو ایک خوش حال جمہوری فلاحی ریاست بنانے میں ہمیں جو ناکامی ہوئی ہے' اس سے نہ صرف پاکستان کے عوام بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کو بڑا دکھ پہنچا ہے۔

یہ برصغیر ہی کے مسلمان تھے جو ۱۹۴۰ء کے بعد جذب و مستی کے عالم میں اپنی منزل کی طرف بڑھے' اور ان کے انداز جنون کے سامنے قیس و کوہکن کی ساری روایات ماند پڑ گئیں۔ مرحوم سید ابوالخیر مودودی سے خاکسار نے یہ سنا ہے کہ قائد آخری بار حیدر آباد دکن گئے' تو وہاں ایک مجلس میں شریک مولانا مناظر احسن گیلانی' جو عالم اور عارف باللہ تھے' اٹھے اور جناح صاحب کے قدموں پر اپنا سر رکھتے ہوئے کہا کہ "آپ اس مرحوم امت کو زندہ کرنے کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں' خدا آپ کو کامیاب کرے۔" مولانا کے اس والہانہ انداز پر پوری مجلس اشک بار ہو گئی۔

یہ جذبہ تھا' جس کا صور تحریک پاکستان نے مسلمانوں کی مردہ روحوں میں پھونکا تھا۔

برصغیر کے مسلمان برطانوی دور میں دو سو سال تک غربت و افلاس اور ظلم و ستم کا برابر نشانہ بنے رہے۔ لیکن ان کے نہاں خانہ دل میں امید کا ایک دیا ہمیشہ ٹمٹماتا رہا۔ یہ دیا' مذہب نے روشن کیا تھا' جو ہر مشکل وقت میں ان کے قلب و نظر کو گرمی عطا کرتا رہا۔ لیکن آج آزادی کے بعد سستی' نااہلی' غیر ذمہ داری' اخلاقی انحطاط اور فکری جمود نے ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے' جہاں خود ہمارے وجود پر انگلیاں اٹھ رہی ہیں' اور "اب نہ منزل کا پتہ ہے نہ شاہراہ منزل پر قدم" اس نامرادی کا شکوہ کس سے کیا جائے۔

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

ہم ایک مدت سے نئی صبح کے مسکرانے کا انتظار کر رہے تھے۔ افسوس! کہ ہماری خود فریبیاں اور تمنائیں ہمیں "حجاز" کی بجائے ترکستان' لے گئی ہیں۔

شریعت کے نفاذ کے لیے اب کیا کرنا چاہیے؟ یہ موضوع دوسرا ہے' اس پر آئندہ بات چیت کریں گے۔

(رشید احمد جالندھری)

ماخذ

۱۔ انگریزی خطبات' لاہور' ص ۱۲۸ (ط۔ سعید شیخ)
۲۔ الطرق الحکمیتہ' قاہرہ' ۱۹۵۳ء ص ۱۴
۳۔ اعلام الموقعین
۴۔ سورہ المائدہ: ۸
۵۔ Systematic Theology' شکاگو' ۱۹۶۳ء' ج ۳' ص ۳۸۶' ۳۸۹
۶۔ تفصیل کے لیے دیکھئے' محسن مھدی: ابن خلدون' شکاگو یونیورسٹی' ۱۹۷۱ء ص ۲۸۶۔ ۲۹۰
۷۔ مقدمہ ابن خلدون' قاہرہ' ص ۲۰۸ (فصل ۲۸)